REVIEW OF RESEARCH
ISSN: 2249-894X
IMPACT FACTOR : 5.7631(UIF)
VOLUME - 10 | ISSUE - 12 | SEPTEMBER - 2021

''مراٹھواڑہ میں اردو شاعری: آزادی کے بعد''

۱۵، ۱۶ فروری ۲۰۲۰ء

مقالہ کا عنوان: اردو شاعری: آزادی کے بعد
مقالہ نگار: عائشہ عبدالعزیز پٹھان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،
پنیہ شلوک اہلیہ دیوی ہولکر شولاپور یونیورسٹی، شولاپور

غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسی لیے رشیدؔ صاحب نے اس کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ ان کے خیال میں ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح، غزل میں اور غزل کی روح، ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ اردو میں اس غزل کی کوئی دو ڈھائی سو سال کی روایت موجود ہے۔ ان دو ڈھائی سو سالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے گزرا ہے، ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے۔ اس کی سچی اور صحیح تصویر ہماری غزل میں ملتی ہے۔ اس عرصے میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے جو کچھ بھی سوچا ہے، جو تصورات بھی قائم کئے ہیں۔ جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہو، ان سب کی صحیح آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے شاید ہی کسی صنفِ ادب نے کی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اس تفصیل و جزئیات کا بیان نہیں ہے، لیکن اجمال و اختصار کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں اس نے جتنا کچھ، اور جیسا کچھ کہہ دیا ہے، کوئی اور صنف اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

غزل کو اسی لیے ہماری زندگی کے ہر دور میں قبول عام کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس نے خواص کی محفلوں میں جگہ بنائی ہے۔ عوام کے دلوں میں گھر کیا ہے۔ حال و قال کی دنیا کے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ اسی لئے وہ زندگی کے ہر شعبہ کا ایک ایسا جز معلوم ہوتی ہے جس کو اس سے جدا کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ غزل اور اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بیسویں صدی کے آغاز سے قبل کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتی۔ غزل کے اصول ایک زمانے تک افراد کے ذہنوں میں ضرور موجود رہے ہیں۔ لیکن کسی نے باقاعدگی سے ان کو پیش نہیں کیا ہے۔ ضمنی طور پر ان میں سے بعض اصولوں کی طرف اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ ان اشاروں کا سراغ ولی، میر، درد، سودا، انشا، مصحفی، جرات، غالب، مومن، ذوق، ظفر، شیفتہ، آتش، ناسخ، داغ، امیر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ حالیؔ نے سب سے پہلے ان اصولوں کو یکجا کر کے ان پر تنقیدی زاویہ نظر سے بحث کی۔ وہ غزل کے پہلے

نقاد ہیں اوراس میں شک نہیں کہ غزل کے اصول پران کا تنقیدی تجزیہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس موضوع پران کی بحث محدود ضرور ہے ،کیوں کہ وہ بہر حال ان کے ''مقدمہ شعروشاعری'' کا ایک حصہ ہے۔لیکن جس انداز میں یہ تنقیدی بحث انھوں نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

حالؔی نے غزل کو نئی روہوں پر ڈالا ہے۔اس کو نئی جولان گاہوں سے روشناس کرایا ہے۔صنفِ غزل میں انھوں نے نئی زندگی پیدا کی ہے۔ان کے زمانے سے غزل کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔انھوں نے غزل کو باعتبار مضامین نہ صرف خود وسیع کیا، بلکہ دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔جو نئے نئے مضامین انھوں نے غزل میں داخل کئے ان میں سیاسی اور سماجی ،قومی اور ملی نوعیت کے مضامین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔حالؔی نے کو اس کا آغاز کیا اوران کے بعد چکبست ،اقبال اور فراق نے اس رجحان کو غزل میں اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچادیا۔حالؔی سیاسی اور سماجی حالات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔انھیں حالات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ان کے پیش نظر تھی۔اوراس کے لئے وہ اظہار زائد بیان کے مختلف وسیلے اختیار کرتے تھے۔غزل کو بھی انھوں نے ان موضوعات کے اظہار کا ذریعہ دور وسیلہ بنایا اوراس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

''مقدمہ شعروشاعری'' میں حالؔی نے غزل اوراس کی اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزل کی زبان کے حدود کو تسلیم کیا ہے۔وہ غزل کے لئے مخصوص الفاظ کے استعمال کو ضروری قرار دیتے ہیں۔کیوں کہ ان الفاظ کے ساتھ طبع کی جذباتی مناسبت معنوی اعتبار سے ایک وسعت پیدا کردیتی ہے۔حالؔی کے خیال میں غزل کی صنف الفاظ کی غرابت اوراجنبیت کو برداشت نہیں کرسکتی۔انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غزل میں ''اگر ایک لفظ بھی غیر مانوس ہوتو برا معلوم ہوتا ہے۔گلاب کے تختے میں کانٹے بھی پھول کے ساتھ نبھ جاتے ہیں۔مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے۔اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اوراخلاق پر رکھی ہے۔ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑتی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر استعمال کئے جاتے تھے۔انھیں الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز واستعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔اوررمزوکنایہ وتمثیل میں اپنے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں۔پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اوراصناف کے سادگی اورصفائی کا خیال رکھا جائے۔آج تک فارسی یااردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی ہے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔''(۱)

غزل کی ہیت کے سلسلے میں الفاظ اور زبان کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اورحالؔی نے غزل کی زبان کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں وہ اپنی جگہ پر اہم ہیں۔اوران سے کسی قسم کے اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔لیکن غزل کی زبان کے اس مسئلے کو حالی نے غزل کی مجموعی ہیت کو سامنے رکھ کر نہیں دیکھا ہے اوراس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں اس ایکا احساس نہیں تھا۔اوراس کے علاوہ وہ غزل کی ہیت کو مجموعی طور پر دیکھنے کا شعور بھی نہیں رکھتے تھے۔شاید اسی لیے غزل میں الفاظ کے استعمال کی نوعیت ان کے یہاں بنیادی حیثیت

اختیار نہیں کرتی، بلکہ اس کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے۔

ترقی پسند ادب کا شعری نظریہ غزل پر کئی طرح سے اثر انداز ہوا۔ شاعری کی پہلی قدر مقصدیت قرار پائی۔ اس لئے وہی غزل ترقی پسند ادب میں قابل قبول ہوئی۔ جو ترقی پسند نظریات کی ترویج میں مددگار ہو۔ ترقی پسندی کے جوش، ولولہ اور خطابت کا جو انداز سارے ادب میں نظر آتا ہے۔ اس کا عکس خالص ترقی پسند غزل میں بھی ملتا ہے۔ اب یہ سوال الگ ہے کہ خالص ترقی پسند غزل کس حد تک غزل رہتی ہے۔ اور اچھی شاعری کے کیا کیا مطالبات پورے کرسکتی ہے۔ لیکن خالص غزل ترقی پسند غزل نے اس غزل کو بھی متاثر کیا ہے۔ جسے ہم خالص غزل (عشقیہ و غیر عشقیہ غزل۔ روایتی اور تقلیدی غزل) کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ترقی پسند غزل کو شعرا کے علاوہ غیر ترقی پسند شعرا بڑی تعداد میں غزل کہہ رہے تھے۔ یہ لوگ غزل کی روایتوں کی توسیع و تقلید کر رہے تھے اور ترقی پسند شعرا کے موضوعات کو بھی اپنے طور پر برتنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی طرح وہ مارکسی نظریہ تنقید کی رو سے ہدف علامت بنے ہوئے تھے۔ ان کی غزلوں کی اشاریت، رمزیت اپنے اندر وہ ادبی پردہ داری رکھتی تھی۔ جس کے بغیر غزل اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن خالص ترقی پسند شعرا اور نقاد ایسی غزل کو ترقی پسند غزل نہیں مانتے ہیں۔ اسلئے یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ خالص ترقی پسند غزل کے کچھ مطالبے اور حدود ہیں۔ انھیں ترقی پسند غزل کہنا زیادتی ہوگی۔

رسائل میں نظم و غزل کے تناسب اور ان کی ترتیب وغیرہ کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کس طبقہ میں "نظم" کی غزل کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ہے اور کیوں اور کس حلقے میں غزل کی اہمیت ہے اور کیوں جس حلقہ میں "نظم" ہی اعلیٰ شاعری ہے۔ وہاں غزل کو بھی بیانیہ نظم سے قریب کرنا غزل کی اصلاح و ترقی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ غزلوں پر عنوان دیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ساری غزل ایک خیال اور ایک احساس اس طرح رکھتی ہے کہ اسے غزل کے فارم میں نظم ہی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غزل کے مصلحین بیشتر ترقی پسند ہیں یا مغربی نظموں کے وہ مقلدین ہیں۔ جو غزل کے اشعار میں مختلف تجربات کے اظہار کو ریزہ خیالی کہتے ہیں، اور ریزہ خیالی کو ناقابل معافی جرم قرار دیتے ہیں۔ روایتی اور تقلیدی ذہن رکھنے والے غیر ترقی پسند غزل کو جہاں ترقی پسند غزل کے موضوعات اور طریقہ کار کی اپنے طور پر تقلید کرتے ہیں۔۔۔۔ وہیں وہ بھی بیانیہ نظم و غزل کے فرق کو اپنے نظم و غزل کے فرق کو اپنے انداز سے کم کرنے کے لیے ترقی پسندوں ہی کی طرح غزلوں پر عنوانات دینا شروع کر دیتے ہیں۔

۱) بہترین ادب:۔ ۱۹۴۷ء

مرتبہ فکر تونسوی عبدالمتین عارف اور چودھری برکت علی۔ مطبوعہ اردو لاہور۔ (اردو ادب لطیف لاہور) میں ۱۳۱ نظمیں اور غزلیں (حفیظ ہوشیارپوری)۔ احمد ندیم قاسمی اور بدایونی، فراق گورکھپوری، عبدالحمید عدم، مسعود حسین خاں اور حافظ بدایونی اور ان کے گیت ہیں۔

۲) بہترین ادب:۔ ۱۹۴۸ء

مرتبہ چودھری برکت علی اور مرزا ادیب اور قتیل شفائی مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور میں ۴۲ نظمیں اور ۱۳۰ غزلیں (جگر مرادآبادی) خاطر غزنوی۔ فیض احمد فیض، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، احمد راہی، جاں نثار اختر، حفیظ ہوشیار پوری، ساغر نظامی، ظہیر کاشمیری اور مجروح سلطان پوری وغیرہ شامل ہیں۔

۳) بہترین ادب:۔ ۱۹۵۰ء

مرتبہ چودھری برکت علی اور ادیب ناشر مکتبہ اردو لاہور میں ۴۲ نظمیں اور ۱۳ غزلیں شامل ہیں۔

۴) بہترین ادب:۔ ۱۹۵۱ء

مرتبہ چودھری برکت علی اور مرزا ادیب ناشر مکتبہ اردو لاہور میں ۱۸ نظمیں اور ۱۱ غزلیں شامل ہیں۔

۵) بہترین ادب:۔ ۱۹۵۰ء

مرتبہ سردار جعفری، وپرکاش پنڈت مطبوعہ شاہراہ دہلی۔ اس میں ۱۷ نظمیں اور ۱۱ غزلیں شامل ہیں۔

۶) بہترین ادب:۔ ۱۹۵۱ء

مرتبہ سردار جعفری، ممتاز حسین، جگن ناتھ آزاد، اور پرکاش پنڈت، مطبوعہ شاہراہ دہلی۔ اس میں ۲۰ نظمیں اور ۲۰ غزلیں شامل ہیں۔

اس سروے سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ترقی پسندوں کی توجہ غزل کے مقابلے میں نظم کی طرف بہت زیادہ تھی۔ وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غزلوں کو بیانیہ نظموں کے قریب کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ترقی پسند غزل پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اور غزلوں پر بھی عنوان دینا عام ہوتا جا رہا تھا۔ غزل کی ریزہ خیالی سے اس حد تک بددل تھے کہ غزل کو خیالی پر عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد کے حملے ہو ہی چکے تھے۔ وہ غزل کی ریزہ خیالی سے اس حد تک بددل تھے کہ غزل کو نظم کا دشمن قرار دیتے تھے۔ مقصدی شاعری ہی کو شاعری سمجھتے تھے۔ اقبال کی شاعری بھی مقصدی شاعری ہے۔

اقبال نے اپنی مقصدی شاعری کے لیے غزل کو بھی جس خوبی استعمال کیا تھا، اقبال نے غالبؔ کے اسلوب اور طریقہ کار سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن غالب کی زبان اپنے زمانے میں کسی حد تک غیر مانوس تھی۔ برخلاف اس کے اقبال کی شاعری غالب کی غزل کی طرح سو فی صدی شاعرانہ نہیں تھی۔ بلکہ اس میں ایک پیام اور مقصد تھا۔ اس پیام کو وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اگر غزل میں اپنے نئے نئے خیالات افکار اور احساسات کو پیش کرنے کے لئے نئی زبان بناتے تو اسے ادبی مزاج سے ہم آہنگ ہونے میں دیر لگتی۔ اور یہ ان کے مقصد کے منافی ہوتا۔ اس لیے انھوں نے نئے نئے خیالات کے لئے روایت کے جانچے اور پرکھے ہوئے زور اثر علائم منتخب کئے۔ ان متغیرانہ علائم، مانوس رمز وایما سے مانوس دلکش اور معنویت پیدا ہوئی۔ اقبال کے نئے افکار و خیالات اس مانوس اسلوب میں نئے ذہن کو اجنبی نہیں معلوم ہوئے۔ روایت اور جدت کا یہ ملاپ ایک جانا پہچانا پراسرار شعری عمل بن گیا۔ اقبال سے پہلے بھی بے خودی عشق، بے

خودی میخانہ وغیرہ اردو غزل میں علامتی استعارے تھے۔ لیکن اقبال نے اپنے نئے اور وسیع مفہوم کے لیے نئی علامے تلاش کرنے کے بجائے مانوس علامتوں کا استعمال کیا۔ اور انھوں نے ان استعاروں اور علائم کے مفاہیم بدل دیے۔

الفاظ و معنی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

اقبال غزل اور مسلسل غزل کی اصلی روح کو سمجھتے تھے۔ وہ چاہے خود کو صرف پیغام لینے والا کہیں اور اپنے شاعرانہ ہونے پر اصرار کریں۔ لیکن وہ یقیناً اچھے اور بڑے شاعر تھے۔ وہ غزل کے مزاج دان تھے۔ غزل کا شعر اس وقت تک غزل کا شعر ہو ہی نہیں سکتا جب تک اپنی جگہ مکمل اور بھرپور نہ ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ہی وہ دوسرے شعر سے رشتہ جوڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ کسی غزل کے سارے اشعار انفرادی طور پر نامکمل ہوں اور ایک دوسرے کے تسلسل ہی سے ان میں حسن و مفہوم پیدا ہو تو ایسے اشعار غزل کے اچھے یا شعر کبھی نہیں ہو سکتے۔ اقبال اس راز کو جانتے تھے، لیکن اقبال کے بیشتر مقلدین اور غزل کے مخالفین اس حقیقت کو نہیں سمجھ پائے تھے۔

ترقی پسند شاعروں نے غزل کی گردن مار دینے کا اعلان نہیں کیا۔ وہ اس لیے کہ اقبال کی اس شاعری میں غزل بھی شریک تھی۔ دوسرے آراگون کی نصیحت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی کہ مختلف مکتبہ خیال کے ادیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھو۔ غزل ہماری تہذیب کی روایت ہے، لیکن اقبال کی کامیابی کا تجزیہ کرنے میں ترقی پسندوں سے ضرور غلطی ہوئی۔ اقبال کی مسلسل غزل پہلے غزل ہے بعد میں مسلسل ہے۔ ہر شعر اپنی انفرادی حیثیت سے مکمل ہے اور اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ ترقی پسند شاعر اور روایتی مقلدین اقبال کی طرح کامیاب مسلسل غزل نہیں کہہ پائے۔ اس لیے کہ ان کے یہاں بیانیہ نظم اور غزل کا بنیادی فرق مٹ جاتا ہے۔ یعنی شعر اپنی انفرادی حیثیت محروم ہو جاتا ہے۔ یہ بات چند مثالوں سے واضح کی جاتی ہے۔

مطربہ وہ دل کی تانیں کیا ہوئیں | وہ تخیل کی اڑانیں کیا ہوئیں
کیا ہوئے وہ ترچھی نظروں کے خدنگ | ابروؤں کی وہ کمانیں کیا ہوئیں
وہ ادائیں جن پہ ہوتی تھیں نثار | چاہنے والوں کی جانیں کیا ہوئیں
کیا ہوئے ٹوٹے دلوں کے زمزمے | بے زبانوں کی زبانیں کیا ہوئیں

کیا ہوئے اختر امیدوں کے حصار
اور عزائم کی چٹانیں کیا ہوئیں

(اختر انصاری شاہراہ دہلی ۱۹۲۹ء)

یہ اشعار ان اچھے دنوں کی یاد میں ہیں جب زندگی حسن وعشق سے عبارت تھی۔ ان مسلسل اشعار کا موضوع اور لہجہ اس دور کی عام اشتراکی مسلسل غزل سے مختلف ہے۔۔۔۔۔۔اس لیے اس میں ایک نیاپن اور تازگی بھی ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی شعر غزل کا اچھا شعر اس لئے نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ مکمل اور تہہ دار ہوتا ہے۔ اس میں تجربات، احساسات کی تہیں ہوتی ہیں۔ ایک تہہ کھل جاتی ہے تو دوسری متوجہ کرتی ہے یہاں ہر تہہ کے لئے ایک سے زیادہ شعر موجود ہے۔ ان اشعار کو الگ الگ کر دیا جائے تو ہر شعر بے مزہ ہو جاتا ہے۔

اب یہاں معین احسن جذبی کی نظم ''اے ہمسفر و'' کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ غزل کے فارم میں ہے۔ یہ غزل کے فارم میں ہے۔ اختر انصاری کے اشعار کا بھی ایک موضوع تھا۔ ان اشعار کا بھی ایک موضوع ہے۔ یعنی ان اشعار میں آزادی کے ساتھ جس حقیقی مسرت کا انتظار تھا۔ اس کے نہ ملنے کا ذکر ہے۔ کوئی شعر اپنی انفرادی حیثیت سے بھرپور نہیں ہے۔ سب اشعار مل کر ایک فضا بناتے ہیں۔

آج بھی کلیوں کے رخسار سے اڑ جاتا ہے رنگ
آج بھی بھول ملول وگراں ملتے ہیں۔

آج بھی جسم اسی طرح ہے مجروح وفگار — آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں
ان کی محفل میں وہ بجتے ہوئے سیمیں نغمے — اب تو کچھ دن یہ انداز فغاں ملتے ہیں

(جذبی۔ ادب لطیف۔ جولائی، ۱۹۵۰ء)

حکیم عبدالکریم ثمر نے اپنی غزل میں حسن وعشق کا تقابل کیا ہے۔ اور عشق کی افضلیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عشق سوز زندگانی کا مآل — حسن رکھتا ہے فقط حسن خیال
حسن ہے اس ذات یکتا کا جمال — عشق ہے صدیق وفاروق وبلال
عشق معقولات کی معراج ہے — حسن موجودات کا ہے اعتدال

حکیم عبدالکریم ثمر ترقی پسند شاعر نہیں ہیں۔ رسالہ شاعر میں ان کا کلام اکثر شریک اشاعت رہتا ہے۔ اشعار میں کوئی تازگی اور جدت نہیں ہے۔ لیکن ان کی مثال اس لیے پیش کی گئی کہ مسلسل غزل کا فیشن ترقی پسند اور باشعور شعرا سے لے کر روایتی اور تقلیدی شعرا میں عام ہونے لگا ہے۔ لیکن کسی کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اس لیے کہ مسلسل غزل، اور غزل کے فارم میں اور بیانیہ نظم میں جو زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسے اکثر نظر انداز کر دیا گیا۔ غزل بقول فراق Series of Climax ہے۔ عموماً مسلسل غزل کہنے والوں نے ایک Climax کو مختلف اشعار میں تحلیل کر کے مفصل کر دیا ہے۔ اس دور کی ایسی بیشتر غزلوں پر جن پر عنوانات ہیں۔ ان میں ایک خیال کو غزل کے فارم میں اس طرح پھیلایا جاتا ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ انھیں معمولی بیانیہ نظم کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ وبا ترقی پسند رسائل کے ساتھ دیگر

مکاتیبِ فکر کے رسائل میں بھی عام تھی۔ جیسا کہ ان چند مثالوں سے واضح ہے۔

۱) رسالہ ''سب رس'' ماہِ اگست و ستمبر ۱۹۴۵ء

ایک سال کی فائل میں بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن پر عام طور سے ایسے عنوانات درج ہیں۔ مثلاً افکار، محسوسات، تجلیات، نواب زادہ جاوید قیصری کی غزل ''پر کیف جاوید'' کا عنوان ہے۔

۲) رسالہ ''شاعر'' آگرہ جولائی ۱۹۳۶ء

سیماب کی غزل و قطعہ پر ''ہم'' ماہر القادری کی غزل پر ''سوز اساز'' صابرا کبرآبادی کی غزل پر ''کمالِ شوق'' ثاقب کانپوری کی غزل پر ''حشرِ جذبات'' اور تصور کرتپوری کی غزل پر تصورات کے عنوانات ہیں۔

۳) رسالہ مارچ ۱۹۴۷ء

سیمابؔ کی غزل پر مقامات نظر بڑی وارثی کی غزل پر ''افسانے'' کیفی چڑیا کوٹی کی گزل ''کیفیات'' آرزو نا گپوری کی غزل پر ''سازِ غزل خواں'' حکیم راغب مرادآبادی کی غزل پر ''عالم جذبات'' احمد سہارنپوری کی غزل ''موجِ تغزل'' الطاف شہدی کی غزل پر ''شام جوانی'' اور سیدہ اخترؔ کی غزل پر جذبات محبت کے عنوان ہیں

۴) شاعر جولائی ۱۹۴۷ء

سیمابؔ کی غزل پر سیاسی غزل کا عنوان ہے۔

۵) نقوش لاہور: مرتبہ ہاجرہ مسرورؔ اور احمد ندیم قاسمی

فیض کی غزل پر ''ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے۔ (مطلع کا پہلا مصرعہ) بطور عنوان ہے۔ انجم رومانی کی غزل ''خاموش خاموش'' کے عنوان سے شریک ہے۔

مسلسل غزل کی یہاں چند مثالیں دینا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ غزل میں مختلف موضوعات کے برتنے کے بیان میں ایسی مثالیں اور پیش ہوں گی۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلسل غزل کا کیا مفہوم عام طور پر اس زمانے میں لیا گیا۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اس دور کی مسلسل غزل عام طور پر غزل ہی نہیں رہتی۔ ان بیانیہ نظموں کا فارم غزل کا ہوتا ہے۔ ترقی پسند نقادوں نے ایک موڑ کو ایک نظریہ کی طرح میکانکی سمجھنے کی غلطی کی، جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

> ''کم از کم میرے خیال میں کہ وقتی جذبے کا ایک ایسا تسلسل جو ایک خاص
> موڑ کو ظاہر کرے، اس کا ہونا غزل کے اشعار میں لازم ہے۔ اگر ایسا نہ
> ہوتو اشعار کا انتشار لکھنے والے کے ذہن اور جزباتی تضاد کو ظاہر کرے گا۔

اور اس لیے مجموعی اعتبار سے غزل کی صورت میں جمع کیے ہوئے یہ اشعار
ایسا تاثر نہیں پیدا کر سکیں گے جس کا اثر پڑھنے والے پر دیرپا ہو۔ اشعار
علٰیحدہ علٰیحدہ اثر کریں تو غزل کی ہیئت مجموعی اعتبار سے کوئی اثر نہ ڈال سکے
گی۔ (۱) (غزل کے جمالیاتی پہلو: ڈاکٹر عبادت بریلوی، منتخب ادب
۱۹۵۱ء مطبوعہ، حالی پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ص۔۸۱)

اس اقتباس میں بظاہر کوئی غلط تجزیہ نہیں کای گیا ہے۔ لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ''موڈ'' کوئی شعوری چیز نہیں ہے۔ دوسرے غزل کی ہیئت کا مجموعی اعتبار سے اثر انداز ہونا بھی کوئی بنیادی قدر نہیں ہے۔ تخلیق میں موڈ اگر کوئی لازمی جز ہے تو اسے شعور سے زیادہ دخل نہیں ہے۔ اگر کوئی شعر یا غزل اداس لہجے کی تخلیق ہے تو اپنے آپ کو شاعر بار بار یہ کیوں یاد دلائے کہ وہ اداس ہے۔ اداسی اس کے تجربات کے پس منظر میں خود جھلکے گی۔ موڈ کا تجربات کے اظہار میں اس سے زیادہ رول نہیں ہے۔

موڈ کا یہ مفہوم لینا کہ زندگی کو مارکسی، اسلامی یا کسی اور نظریے سے سمجھا جائے یا ایک خیال کا ارتقا غزل کے فارم میں پھیلا دیا جائے۔ غزل کی بنیادی صفت اور روح سے انحراف ہے۔ موڈ، خیال اور فکر میں فرق ہے اور اسی موڈ میں اور اداسی کے مختلف رنگ اور جھلکیاں نظر آ سکتی ہیں۔ ان میں یاد کا رنگ بھی ہو سکتا ہے۔ یاد کا دائرہ عموماً خوشگوار اور نشاطیہ لمحوں کی بازیافت سے بھی وابستہ ہو سکتا ہے۔ اب اداسی کے موڈ میں یاد کے وسیلے سے نشاطیہ لمحوں کی بازیافت ایک مرکب کیفیت بن گئی۔ دراصل ایسی ہی مرکب کیفیات کے اظہار میں تہیں پیدا ہوتی ہیں۔ ترقی پسند نقاد عموماً ایک خیال کے واضح پھیلاؤ کو ایک موڈ کی غزل سمجھتے ہیں۔ جو یقینا بیانیہ غزل ہے۔ ان کے یہاں موڈ نظریہ کی طرح اٹل ہے۔ جو سراسر غلط ہے جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے۔ اوپر کے پیش کیے اقتباس میں ''موڈ'' کا مفہوم غلط لیا گیا ہے۔ اس کو ثبوت عبادت بریلوی کی یہ وضاحت ہے۔ اساتذہ قدیم کی اعلیٰ غزلیہ شاعری ان کے نزدیک ایک ''موڈ'' کی غزل اس لیے نہیں ہو پائی ہے کہ اس میں ایک خیال یا ایک جذبہ کی وحدت میں تمام اشعار پروئے ہوئے نہیں ہوتے ہیں۔

''میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ دبستان دلی کے ابتدائی دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے غزل کی ہیئت کو سو فیصدی مکمل طور پر صحیح برتا ہے۔
ایسا نہیں ہے کیونکہ غزل میں موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت ہے جو ایک قسم کا ربط و
تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ اس کا شعور پوری طرح نہیں تھا۔ اس وجہ سے بعض غزلوں
میں ان کے یہاں مختلف موضوعات ملے جلے نظر آتے ہیں۔''

اس طرح کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کے بنیادی مزاج اور کردار سے لکھنے والے کو واقفیت نہیں ہے۔ وہ ربط و تسلسل کو غزل میں

بنیادی قدر سمجھتا ہے۔اور مختلف موضوعات کو برتنا غزل کا عیب سمجھتا ہے۔ یہ بیانیہ غزلوں کو اعلیٰ شاعری سمجھتے اور انھیں کے معیار پر غزل کو پرکھنے کا نتیجہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ غزل کے موضوعات کی نہیں بلکہ تجربات کی شاعری ہے، اس کے ہر شعر میں ایک تجربہ اپنا مکمل اظہار پا لیتا ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ حسن قطعی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مقصدی شاعری انسانی احساسات سے زیادہ نظریات کی تشریح و تبلیغ کو پیش نظر رکھتی ہے۔ جس میں حقائق کا بیان اور فکر و عمل کا طے شدہ پروگرام ہے۔ایسی نظم و غزل جس میں زور اثری، منطقی استدلال وضاحت اور قائل کرنے کی خوبی نہ ہو، اچھی مقصدی شاعری مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ ترقی پسند نقاد اشعار میں تہ در تہ احساسات کے وسیلے سے شعر کو پرکھنے کے بجائے اپنے نظریوں سے جانچنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ممتاز حسین بھی قدیم غزل کو اچھی غزل نہیں مانتے۔ اس لیے کہ اس میں زندگی کے لیے کوئی مقررہ اور طے شدہ پروگرام نہیں ہے۔

قدیم غزل میں انھیں دو بڑی خامیاں نظر آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اجتماعی اور سماجی شعور کی عکاسی کے بجائے فرد اور اس کی اہمیت پر زور دیتی رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں تصوف کا فیشن تھا۔ اور تصوف کے پاس کوئی مقررہ اور طے شدہ نظریۂ زندگی نہیں تھا۔ اس لیے غزل فرد کے انتشار پسند خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے۔

ترقی پسند نقادوں، شاعروں اور مقصدی شاعروں کے ذہن میں نظم اور غزل کا انفرادی کردار اور مزاج واضح نہیں تھا۔ انھوں نے غزل کے اس ہنر کو جو مختلف تجربات کا ایک گلدستہ پیش کرتی ہے۔اسے عیب سمجھا انھوں نے اپنے پیش رووں کے اس اعتراض کو بالکل صحیح مان لیا ہے کہ غزل میں مختلف تجربات کا بیان ریزہ خیالی ہے۔اور یہ جرم ہے۔ اقبال کی کامیابی نے کسی کو یہ کہنے کی جرات نہیں پیدا کی کہ غزل نئی زندگی اور اس کے احساسات کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ اور کسی پیام کی پیامبر نہیں بن سکتی۔ ترقی پسندوں کا سیاسی مسلک بھی غزل کی غزلیت سے زیادہ بیانیہ نظموں پر توجہ دی اور اسے قابل قدر صنف سمجھا اور غزل کے نام اور ہیئت کو لے کر اسے بیانیہ نظموں سے قریب کرنے کی کوششیں کیں۔ اس لیے غزلوں پر عنوانات دیے جانے لگے۔ غزلوں میں ایک خیال کو پھیلایا گیا۔ اور اسے نظم کے مقابلے میں کم اہمیت والی اصلاح طلب صنف سخن سمجھ کر برتا گیا۔

ترقی پسند غزل:۔

مارکس کا نظریہ تاریخی مادیت Historical Materialism یہ ہے کہ مادہ، ارتقا پذیر ہے۔ اس کا ارتقا جدلیاتی Dialecticl ہوتا ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ مادہ مختلف کیمیائی راستوں سے وجود میں آیا۔۔۔۔ اور اس عمل Thesis اور رد عمل Antithesis کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور اس طرح ایک نیا عمل (Synthesis) وجود میں آتا ہے۔ گویا کسی چیز کو دائمی ثبات اور جمود ممکن نہیں، اور ان تمام تبدیلیوں کے پیچھے جس کو ہم بنیادی مرکز کہہ سکتے ہیں، وہ اقتصادی رشتہ ہے مارکس کا کہنا ہے کہ:

”سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی کو عام طور پر مادی زندگی کے طریقے اور اس کے آداب مقرر کرتے ہیں۔“

گویا ذہنی زندگی کی اہمیت مادی اور اقتصادی رشتوں کے مقابلے میں ثانوی ہوئی۔ اس بات سے کوئی مارکسی نظریہ حیات اور مارکسی ادب ماننے والا انکار نہیں کرتا، لیکن اس کی تشریح میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔

پہلا کٹر گروہ اقتصادی رشتوں کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔ اور ذہنی رشتے میں علوم و فنون، شعر و ادب آتے ہیں۔ ان کو اقتصادی رشتوں کا تابع محض سمجھتا ہے اور ذہنی رشتوں کی کوئی ایسی حیثیت ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ جو مادی اور اقتصادی رشتوں کی کوئی پر خاطر خواہ اثر انداز ہو سکے۔

دوسرا گروہ ذہنی رشتے کی اس درجہ ''فضولیت'' کا قائل نہیں ہے۔ وہ مارکس کے قول کی یوں تشریح کرتا ہے کہ عام طور سے اقتصادی رشتے ذہنی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ذہنی اثرات کسی نہ کسی حد تک مادی زندگی کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد مادی رشتے ہی فیصلہ کن ثابت ہوں۔ مگر ایک وقفے (اور جس کی کوئی بھی مدت ہو سکتی ہے) تک ذہنی رشتے مادی اور اقتصادی رشتوں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

آزادی کے بعد جس شدید مایوسی، ویرانی، تاریکی، بے اطمینانی اور غیر محفوظیت کو اردو داں طبقے نے محسوس کیا۔ اس کا نمونہ یہ اشعار ہیں۔ ان میں موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے اکثر مسلسل غزل کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً افسر سیمابی، سر پرکابری اور ادیب مالیگانوی کی غزلوں کے اشعار بیانیہ مسلسل غزل ہیں۔ یا ان پر اگر عنوان درج کر دیا جائے تو غزل کے فارم میں بیانیہ نظم بن سکتے ہیں۔

دل ہیں بجھے بجھے تو فضائیں رندھی ہوئیں
پھولوں کی انجمن نہیں یہ انجمن ابھی (اثر لکھنوی)

بھیگی ہوئی ہے خون میں ارض وطن ابھی
بے آبرو ہے وادیٔ گنگن و چمن ابھی

ہر پھول اک مجاور ماتم خروش ہے
گونجا ہوا ہے شعور فغاں چمن میں

ٹوٹے ہوئے ہیں حسن و صداقت کے آئینے
ہے گیسوئے حیات شکن در شکن ابھی

غلطیاں خاک و خون میں ہیں کتنے حق پرست
ہے کربلائے عصر سواد وطن ابھی (افسر سیمابی، احمد نگری)

۱۹۴۷ء کے بعد خوابوں، آدرشوں کا حاصل بڑا بھیانک اور عبرت ناک ہوا۔ انسان کو جس تاراجی، خوں ریزی، اور غیر محفوظیت

کا تجربہ ہوا۔اس کے نتیجے میں شدید اضطراب تشکیک عدم اعتماد کا رویہ ابھرا۔ سیاست کی کم مائیگی، بے صبری، خود غرضی، کا تجربہ ہوا۔ اور حساس ذہن، نا امیدی، بے یقینی کے عالم میں، اجتماعی تحریکوں اور نظریات کو چھوڑ کر اپنے میں اس طرح سمٹا کر اس کی شخصیت میں روح عصر مجسم ہوگی۔ اس طرح جن لوگوں نے اپنی شخصیت کے وسیلے سے اپنے عہد کو پیش کیا۔ ان کے کلام میں اپنے دور کی حسیت بھی ہے اور ان کی شخصیت کی انفرادیت بھی ہے۔

غزل کے علاوہ غزل کے مختلف اشعار کے بارے میں حالؔی نے اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن یہ خیالات بھی غزل کی مجموعی ہیئت کو سامنے رکھ کر پیش نہیں کئے گئے ہیں۔ حالؔی نے غزل کے مختلف اشعار کے جمالیاتی پہلو اور ان کی ہیئت وصورت کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سلسلے میں بعض بڑے کام کی باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے ان غزل گو شعرا کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ جو اپنی غزل میں بھرتی کے اشعار صرف غزل کو پورا کرنے کی غرض سے جمع کر دیتے تھے۔ انھوں نے بعض شعرا کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ غزل میں دو ایک شعر سے زیادہ اچھے شعر نہیں کہے جا سکتے۔ مومن، غالب اور شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "یہ لوگ بھی اعلیٰ درجے کا شعر اسی کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو کے محاورے میں ادا ہو جاتا تھا۔

ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجے کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہے۔ اگلے شعرا اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک یا دو شعر اچھے نکل آئے۔ باقی کم وزن اور پھس پھسے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ ہم لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے چست کر دیتے ہیں۔ تاکہ بادی النظر میں حقیر نہ معلوم ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ انھیں معمولی خیالات کو جودت سے مختلف شکلوں میں نبھے چلے آئے تھے۔ بہت کم باندھتے تھے۔ بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہئے۔ اس لیے اردو روزمرہ کا سر رشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ ہاں ہمہ غزلیت کی شان ان کے تمام کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور صاف اور بامحاورہ اور بلند اشعار ان کے ہاں بھی نسبتاً اتنے ہی نکل سکتے ہیں۔ جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔(۱) (حالؔی: مقدمہ شعر وشاعری، ص ۱۵۷)

ان خیالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر غزل کے شعر کی اچھائی اور برائی کے متعلق حالی ایک شعور رکھتے تھے۔ انھیں اسباب کا بھی احساس تھا کہ غزل کے ہر شعر میں جدت اور اپج ہونی چاہیے۔ سادگی اور صفائی ہونی چاہیے۔ روزمرہ اور محاورے کی پابندی ہونی چاہیے۔ اور ساتھ ہی وہ اس بات کے شکوہ سنج بھی تھے کہ اردو کے بہت سے غزل گو شعرا نے غزل کے بنیادی مقتضیات کو پورا نہیں کیا اور اپنی کمزوریوں پر دوسرے طریقوں سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ بات ان کے نزدیک مستحسن نہیں۔ لیکن یہ تمام باتیں بھی حالی نے صنف غزل کو مجموعی ہیئت کو سامنے رکھ کر نہیں کہی ہیں۔ ان کے پیش نظر غزل کے مختلف اشعار کی ہیئت تھی۔ اور مختلف ہیئت پر نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حالی غزل کے ارتقا کو پیش کرتے ہوئے اور مختلف غزل گو شعرا پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس بات کی وضاحت ضرور کرتے کہ مجموعی اعتبار سے انھوں نے غزل کی ہیئت کو کس طرح برتا؟ حالؔی کا تجزیہ اسی وجہ سے غزل کی ہیئت کا تجزیہ باقی نہیں رہتا۔ وہ اس

کے مختلف اشعار اور چند پہلوؤں کا تجزیہ ہوتا ہے۔اس کا سبب یہی ہے کہ حالؔی کے یہاں غزل کی مجموعی ہئیت کا کوئی شعور نہیں تھا۔اگر ایسا ہوتا تو انھیں خیالات کے ضمن میں جن کو حالؔی نے غزل کے اشعار کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔وہ اس موضوع پر بھی اچھی طرح روشنی ڈال سکتے تھے۔

حالی جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا ہے،غزل کی ہئیت کے بعض پہلوؤں کا شعور ضرور رکھتے تھے۔غزل کی زبان،اس کے اشارے ،اس کے کنائے ،اس کی تمثیلیں ،اس کا انداز بیان،ان سب کی اہمیت کا انھیں احساس تھا۔وہ ان سب کو غزل کے لوازم سمجھتے تھے۔لیکن ان پر بحث کرنے کے سلسلے میں وہ ان کے درمیان کسی منطقی ربط اور تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔انھوں نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے انفرادی رنگ میں دیکھا ہے۔اگر وہ ان کو مجموعی اور منطقی طور پر دیکھتے تو شاید نتائج کچھ اور نکلتے۔زبان و بیان کے ساتھ ساتھ انھوں نے غزل کے ردیف وقوافی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔غزل کی ہئیت میں قوافی و ردیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔لیکن اس کو بھی انھوں نے علاحدہ کر کے دیکھا ہے۔

غزل کی مجموعی ہئیت کو سامنے رکھ کر اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔وہ قوافی اور ردیف کے مخالف ہیں۔ان کا بس چلتا تو قوافی اور ردیف دونوں کو غزل کی ہئیت سے خارج کر دیتے۔انھوں نے قافیہ اور ردیف دونوں کو بے کار قرار دی دیا ہے۔کیونکہ وہ موضوع کو پیش کرنے میں حائل ہوتے ہیں۔انھوں نے اس کی جمالیاتی حیثیت کو محسوس نہیں کیا۔قافیے کو ختم کرنے کا مشورہ دیا۔اور قافیے کے استعمال میں بہت سی شرطیں لگا دیں۔غزل میں قافیے اور ردیف کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

''ہمارے ہاں قافیے کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھلا لگا دیا گیا ہے۔اگر چہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے۔جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے۔لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔

اگر تمام اردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔پس جب کہ ردیف اور قافیے کی گھاٹی خود دشوار گزار ہو تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور نا قابل گزر بنانا انھیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا تمام تر محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں۔اور بس اور پھر اس بحث کے بعد یہ مشورہ دیا ہے کہ پس ''شاعر کو چاہئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیے سے میل کھاتی ہو۔''(۱)

(حالؔی: مقدمہ شعر وشاعری۔ص ۱۸۵)

ردیف وقافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں۔بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں۔اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہئے۔قافیہ ایسے اختیار کرنا چاہئے۔جس کے لیے قدر ضرورت سے دس گنا بلکہ بیس گنا الفاظ موجود ہیں۔ورنہ مضمون کو قافیے کا تابع کرنا پڑیگا۔قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے۔(۲) (حالؔی:مقدمہ شعر وشاعری۔ص ۱۸۶،۱۸۷)

حالؔی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے پیشِ نظر معنویت تھی۔ اور یہ خیال ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ قافیے اور ردیف موضوع کو پیش کرنے میں حائل ہوتے ہیں۔ اور قافیہ معنویت کو پس پشت ڈال کر شاعری کو قافیہ پیائی بنا دیتا ہے۔ ان کا یہ خیال کسی حد تک ٹھیک بھی ہو۔ اردو کی غزلوں میں اس حقیقت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن حالؔی اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے اگر غزل کی ہیئت کو دیکھا جائے تو قافیہ اور ردیف اس میں ایک جمالیاتی اثر پیدا کرتے ہیں۔ یہ احساس حالؔی کو اس وقت ہو سکتا تھا جب غزل کی مجموعی ہیئت ان کے پیشِ نظر ہوتی۔ اس کو انھوں نے سامنے نہیں رکھا۔ اسی لیے ردیف و قافیے کے متعلق جمالیاتی اعتبار سے منطقی انداز میں وہ بحث نہ کر سکے اور ان کا یہ مطالعہ سرسری سا ہو کر رہ گیا۔ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ لیکن وہ غزل کا ایک پہلو ہے۔ انھوں نے اسی ایک پہلو کو سامنے رکھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی اس بحث میں ہمہ گیری نظر آتی ہے۔

غزل کی معنوی اصلاح کے جوش میں حالؔی نے غزل کے جمالیاتی پہلو اور خصوصاً اس کی ہیئت کو نظر انداز کر دیا۔ اور اگر اس بحث میں کہیں جمالیاتی پہلو آیا بھی، اور اس سے پہلو تہی کر گئے۔ کیوں کہ معنویت کے شدید احساس نے انھیں ایسا کرنے ہی نہیں دیا۔ حالؔی نے جس زاویہ سے غزل کا مطالعہ کیا وہ اصلاح ہے۔ اور اصلاح بھی ایسا جس کی نوعیت معنوی ہو۔ چنانچہ غزل کے سلسلے میں انھوں نے موضوع اور مواد ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

اردو غزل کا مستقبل جن لوگوں کو تاریک نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ صنفِ سخن ترقی نہیں کر سکتی۔ لیکن حقیقت ہے کہ اردو غزل کی ترقی کے لیے اب جا کر راہیں کھلی ہیں۔ کیوں کہ وہ جمالیاتی شعور، وہ ہیئت اور تکنیک کا احساس جو آج ہمارے ادب میں عام ہو رہا ہے اس نے غزل کو اس کی صحیح جمالیاتی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں غزل نے خود اپنے آپ کو پانے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جاتی کتب:

۱) آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر بشیر بدؔر

۲) غزل اور مطالعہ غزل — عبادت بریلوی

۳) مقدمہ شعر و شاعری — الطاف حسین حالؔی

Prof. Ayesha A.Aziz Pathan
Asst.Professor, Punyashlok Ahilyadevi Holkar Solapur University, Solapur.